بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن اور اقبال

بسم اللّٰہ والحمد للّٰہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللّٰہ وعلی آلہ وصحبہ ومن والاہ.

جب ہم اقبال کے کلام و افکار پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ اقبال ایک وسیع الجہات کلام ہے' اور اسی وسیع الجہتی کے پیش نظر لوگ اسے اپنے مطلب کے لیے اور مختلف نظریات پھیلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آج کے زمانے میں یہ بات زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کہ کسی شاعر کے کلام میں اس کا منشا کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مصنف کی وفات کے بعد مفہوم متعین کرنا قاری کا کام ہے' چناں چہ وہی مفہوم معتبر ٹھہرے گا جو قاری سمجھے گا۔ اسی لیے مختلف لوگوں نے اپنا مطلب برآری کے لیے اشتراکیت' کہیں قومیت تو کہیں فسطائیت کی تائید کے ذیل میں کلام اقبال کا حوالہ دیا۔ اسی لیے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے ایک بے حد دلچسپ عنوان کے ساتھ مضمون لکھا تھا: ''اقبالیات کے بہتر فرقے''۔ یعنی جس طور پر امتِ مسلمہ میں بہت سے فرقے وجود میں آئے اسی طور پر اقبالی فکر کے بھی بہت سے فرقے ہو گئے۔ لیکن اس سے قطع نظر اگر ہم دیانت داری کے ساتھ اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کے تمام بڑے تصورات قرآن ہی سے مستعار ہیں۔ اور اس دعوے کو معیاری استدلال کی روشنی میں ثابت کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔

اقبال کی اصل حیثیت و مرتبہ:

اقبال کے ساتھ ایک ظلم یہ ہوا کہ جو پیغام اور مشن وہ قوم کو پہنچانا چاہتے تھے اس کا اس قدر غلغلہ ہوا کہ ان کی شاعری' اور فنی حیثیت و مرتبہ دھندلا کر پس منظر میں چلا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ خود اقبال نے بھی اپنے بارے میں بہت سی جگہوں پر اس نوعیت کی باتیں کہیں اور لوگوں نے ان باتوں کو بہت ہی سنجیدگی سے قبول کر لیا۔ اقبال نے بارہا اس طرح کہا کہ مجھے شاعر نہ سمجھو' میں محض شاعر نہیں ہوں' جیسے:

نغمہ کجا و من کجا ساز و سخن بہانہ ایست سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را!

''کہاں شعر و نغمہ اور کہاں میں!! اور یہ جو ساز و سخن ہے درحقیقت ایک بہانہ ہے' اصل مقصود تو اس امت کی راہ گم کردہ اونٹنیوں کو راستے پر لانا ہے۔''

اور:

من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم مرا یاراں غزل خوانے شمردند

''اے میرا اُمم ﷺ! میں آپ سے دادرسی کا طالب ہوں' دوستوں نے تو مجھے غزل خواں سمجھ لیا ہے۔''

اسی طرح ایک جگہ کہا کہ:

نہ بینی خیر ازاں مَردے فرو دست کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

''اس بدبخت انسان میں کوئی خیر نہیں جس نے مجھ پر صرف شعروسخن کی تہمت جڑ دی ہے۔''

اسی قبیل کے کئی اور اشعار اقبال نے کہے' مگر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اقبال کے بلند مرتبے کی بنیادی وجہ ان کی شاعری ہے' وہ ایک بہت بڑے شاعر ہیں' ورنہ ظاہر بات ہے کہ فکرِ قرآنی اور اسرارِ اُمت پر تو کئی ایک شخصیات نے اقبال سے بھی بڑھ کر بہت تفصیل اور اطناب سے کلام کیا ہے' اور اپنی قیمتی فکر امت کے سامنے پیش کی ہے۔ لیکن اقبال کی اصل اہمیت اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اس فکر کو پیش کرنے کے لیے شاعری کا اسلوب اور سانچہ اختیار کیا جو کہ بہت اعلیٰ تھا۔

اقبال کے علاوہ اسدؔ ملتانی' نعیمؔ صدیقی اور ماہرؔ القادری بھی ایسے شعراء ہیں جن کے یہاں یہی مضامین پائے جاتے ہیں' اور اسلوب بھی شاعری کا ہے' اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے دل میں امت کا درد اور دین کا جذبہ اقبال سے کہیں زیادہ ہو' لیکن اس سب کے باوجود یہ اقبال کے مرتبے کے لوگ نہیں ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہ فن شاعری کے اعتبار سے اقبال کے ہم پلہ نہیں' اقبال ان سے بہت آگے ہیں۔

اقبال کی امتیازی خصوصیت:

اقبال بہت بڑے شاعر تھے' اور اعلیٰ شاعری کے جو معیارات ہیں ان پر پورا اترتے تھے' اور اقبال کا دوسرا بہت بڑا کمال یہ ہے کہ ان کی شاعری کا بڑا حصہ مقصدی شاعری پر مشتمل ہے۔ مقصدی شاعری کے بارے میں عام تأثر یہ ہے کہ وہ فنی اعتبار سے کچھ کم تر ہوتی ہے' کیوں کہ اس میں پہلے سے ایک سوچ اور موضوعیت شامل ہوتی ہے اس لیے اس میں عام طور پر فنی بلندیوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ لیکن اقبال کے یہاں ایسا نہیں ہے' اقبال نے بہت سے فلسفیانہ اور اخلاقی تصورات اور پیچیدہ و مشکل مضامین پیش کرنے کے لیے عمدہ شاعری کا لبادہ ایسے استعمال کیا ہے کہ ہمارے خیال کے مطابق اردو کی تین سو سالہ تاریخ اتنے عمدہ شعری اسلوب کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے' جو پیچیدہ مضامین پر بھی مشتمل ہو اور فنی بلندیوں پر بھی پوری اترتی ہو۔ یقیناً اس معاملے میں اقبال اپنی مثال آپ ہیں۔

مخاطبین پر اقبال کا اثر:

اقبال کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ان کا اپنے مخاطبین یا اپنی قوم پر ایک خاص اثر تھا جو کہ چند شاعروں کو چھوڑ کر کہیں نظر نہیں آتا کہ کسی شاعر نے اپنی قوم کو اتنا متاثر کیا ہو۔ ہومر کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے یونانی تہذیب پر اتنا ہی اثر ڈالا ہے جتنا اقبال نے' اسی طرح فردوسی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ایرانی قوم کا ضمیر زندہ کر دیا' لیکن اس طرح کی مثالیں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ بہرحال یہ اقبال کی ایک امتیازی

خوبی ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو کچھ مخصوص تصورات کے ساتھ مخاطب کیا' اور غیر معمولی طور پر اثر ڈالا۔

اقبال کے فلسفیانہ خیال واسلوب کا معیار:

یہ بات بھی اہم ہے کہ اقبال کے بیشتر خیالات فلسفیانہ ہیں' اور فلسفے میں خیال کی تشکیل کے لازمی اجزاء کو اقبال نے کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ حالانکہ شعر کا سانچہ اور ہوتا ہے' نثر کا اور ہوتا ہے۔ خود اقبال نے بھی اپنے بارے میں کہا ہے کہ میں نے دو طرح کے اسلوب اختیار کیے ہیں۔ ایک رویہ میں نے نثر میں اختیار کیا ہے' اور ایک رویہ شعر میں اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ بھی بہت بڑی بات ہے کہ اقبال نے پیچیدہ مباحث کو شاعری میں سمونے کے باوجود ان کے معیاری سانچوں کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ یعنی اپنے تصورات کا معیار نیچا نہیں کیا۔

مسلمانوں کے لیے راہ نما تصورات:

اقبال نے اسلامی نظریہ فراہم کرنے میں ہماری بہت زیادہ راہ نمائی کی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں تین بنیادی خیالات یا تصورات ہیں: انسان کیا ہے' کائنات کیا ہے' اور خدا کون ہے۔ یہ تینوں ہمیں اقبال کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ ان کا ایک قطعہ ہے:

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں' نے خدا بیں' نے جہاں بیں یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا!

اسی طرح ایک جگہ فارسی میں کہا:

عالم از رنگ است و بے رنگی است حق چیست عالم؟ چیست آدم؟ چیست حق؟

''یہ عالمِ کثرت ہے' اس میں رنگا رنگی و بوقلمونی ہے' لیکن حق کا عالَم بے رنگ ہوتا ہے۔ عالم کیا ہے؟ آدم کیا ہے؟ اور حق کیا ہے؟''

لہٰذا ایک بات تو یہ ہوئی کہ اس دور میں اسلامی نظریہ تشکیل دینے میں ہمیں اقبال سے بے حد مدد ملتی ہے' کیوں کہ اس تشکیل کے تمام بنیادی اصول اقبال کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

اعلیٰ ذہانت اور جذبے کا امتزاج:

اگر ہم اقبال کا سنجیدگی سے مطالعہ کریں تو ہمارے مخصوص دینی تصورات واحساسات کی سطح بہت بلند ہو جاتی ہے' کیونکہ اقبال کے یہاں دو چیزیں جمع ہیں: اعلیٰ ذہانت اور اعلیٰ جذبہ۔ اور جب یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو معاملہ دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح Friedrich Nietzsche (نطشے) نے اپنی کتاب The Birth of Tragedy میں لکھا ہے کہ Apollonian spirit (عقلی و منطقی روح) ہے' اور ایک Dionysian spirit (جذباتی روح) ہے۔ ایک میں نظم و نسق ہے' اور ایک میں طاقتِ نفاذ ہے۔ اگر کلام میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں تو ایک بڑا اور اعلیٰ کلام وجود میں آتا ہے۔ اقبال کے یہاں ہمیں یہ دونوں چیزیں نظر آتی ہیں۔ ان کی علمیت بلند اور ان کا جذبہ بلند تر ہے' جس کے باعث ان کے کلام کا معیار بہت بلند ہو جاتا ہے۔

اقبال اور مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ :

اقبال اور قرآن کی نسبت سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے خود جنہیں اپنا مرشد کہا ہے' وہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ چنانچہ ''بالِ جبریل'' میں پیر و مرید کے عنوان سے ایک مکالماتی نظم بھی ان کے حوالے سے موجود ہے۔ اقبال ان سے بہت متاثر تھے' اسی لیے اقبال نے انہیں اپنا مرشد کہا' اور ایک جگہ بہت خوب صورت انداز میں بیان کیا کہ :

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار　　اک بحر پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومی
تو بھی ہے اسی قافلہ شوق میں اقبال　　جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

یہی مولانا رومی ہیں جن کی شاعری کے بارے میں جامی نے کہا تھا کہ :

مثنویٔ　معنویٔ　مولوی　ہست قرآں در زبانِ پہلوی!

''مولانا کی مثنوی معنوی درحقیقت قرآن ہی کا بیان ہے پہلوی یعنی فارسی زبان میں۔''

اقبال نے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کو بے حد بلند مرتبہ دیا ہے۔ رومی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دو چیزیں بہت نمایاں ہیں: قرآن سے تعلق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق' جس کی واضح مثال رومی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر ہے کہ :

من بندۂ قرآنم اگر جان دارم　　من خاکِ درِ محمدِ مختارم

''میں تو قرآن کا غلام ہوں جب تک میری جان میں جان ہے۔ اور محمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم کے در کی خاک ہوں۔''

چنانچہ اقبال کی شخصیت میں بھی یہی دو بنیادی عناصر واضح نظر آتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے کہ قرآن کیا ہے تو واضح ہوتا ہے کہ قرآن وہ سنگم ہے جہاں آ کر تعلق مع اللہ اور تعلق مع الرسول اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ قرآن کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے تعلق کی کوئی بنیاد ممکن ہی نہیں ہے۔ خود اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ سَبَبٌ طَرَفُهُ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهُ بِيَدِكُمْ))

''یہ قرآن اللہ کی تنی ہوئی رسی ہے' اس کا ایک حصہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک حصہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

لہٰذا قرآن سے تمسک کے بغیر تقرب اِلی اللہ کا کوئی تصور ممکن نہیں ہے۔ اس موضوع سے متعلق بہت سے مکاشفات بھی ملتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ انہیں خواب میں تجلیٔ حق ہوئی' تو انہوں نے پوچھا کہ اے باری تعالیٰ! تجھ تک پہنچنے کا سب سے آسان طریقہ کیا ہے؟ باری تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھ تک پہنچنے کا سب سے آسان طریقہ میری کتاب یعنی قرآن ہے۔

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے دیکھئے' تو آپ کا ترکہ بھی یہی قرآن ہے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے' ایک صحابی کا وہاں سے گزر ہوا' کہنے لگے کہ تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو جب کہ مسجد میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ترکہ تقسیم ہو رہا ہے! لوگ دوڑے دوڑے گئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی جُبّہ' کوئی پیالہ' یا کوئی تبرک ہمیں بھی مل جائے' لیکن مسجد میں جا کر دیکھا تو وہاں کچھ لوگ بیٹھے قرآن پڑھ پڑھا رہے تھے۔ واپس آ کر شکایت کی کہ آپ نے غلط

بیانی کی ہے۔تو صحابی نے جواب دیا کہ نبی اکرم ﷺ کا ترکہ یہ قرآن ہی تو ہے۔ نبی ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ:

((اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِینَارًا وَلَا دِرْھَمًا' اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ ، فَمَنْ اَخَذَ بِهٖ فَقَدْ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ))

''انبیاء کرام (علیہم السلام) ترکے میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے' ان کا ترکہ علم ہوتا ہے' جس نے اس علم میں سے حصہ پالیا' اس نے پیغمبروں کے ترکے میں سے وافر حصہ پالیا۔''

لہٰذا تعلق مع الرسول کی کلید تعلق بالقرآن ہے' اور یہی تعلق مع اللہ کی کُنجی ہے۔

قرآن اور اقبال:

سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دو واقعات ایسے ہیں جو اقبال کی زندگی میں واضح موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ایک تو نسبتاً ان کے بچپن کا واقعہ ہے کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے تو ایک بار ان کے والد نے ان سے پوچھا کہ کیا پڑھ رہے ہو؟ کہا کہ قرآن مجید پڑھ رہا ہوں' کہا کہ کچھ سمجھتے بھی ہو؟ کہا کہ کچھ سمجھتا ہوں اور کچھ نہیں سمجھتا۔اس پر ان کے والد نے کہا کہ جب تم قرآن پڑھو تو اس طرح پڑھو گویا قرآن تم پر ہی اتر رہا ہے' یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔

اور دوسرا واقعہ یہ کہ ان کے والد نے ان سے ایک مرتبہ کہا کہ میں نے تمہاری پرورش کی ہے' تمہیں پڑھایا لکھایا ہے' میں تم سے اس کا ایک معاوضہ چاہتا ہوں۔اقبال نے پوچھا کہ کیا معاوضہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ تم اسلام کی خدمت کرو گے' اسلام کے خادم بنو گے! علامہ نے لکھا ہے کہ جب ان کے والد مرض الموت میں تھے تو اقبال ان سے ملنے گئے۔اقبال نے ان سے پوچھا کہ ابا جان! جو آپ نے مجھ سے بات کہی تھی کیا وہ میں نے پوری کر دی؟ تو انہوں نے پُرنم آنکھوں سے کہا کہ ہاں! تم نے پوری کر دی۔اس وقت تک ایک ملی شاعر کی حیثیت سے اقبال کی شہرت ہو چکی تھی۔

قرآن سے دیرینہ لگاؤ:

اقبال کی مثال ان لوگوں کی سی نہیں ہے جو سرد مزاج اور فقط اداروں سے وابستہ دانشور ہوتے ہیں' جن کے یہاں صرف زبان و قلم کی حد تک باتیں ہوتی ہیں' اور عملی زندگی سے بالکل تہی دامن ہوتے ہیں۔اقبال کا تعلق قرآن کے ساتھ غیر معمولی تھا۔قرآن مجید کی تلاوت ان سے کبھی نہیں چھوٹی' وہ روزانہ صبح کی تلاوت کیا کرتے تھے' اور اکثر تلاوت کے دوران آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے' اور آخری زمانے میں تو خود کہتے تھے کہ ''بس دو چیزیں ہی میرے زیر مطالعہ رہتی ہیں: قرآن مجید اور مثنوی مولانا روم۔ان کے سوا میں نے ہر کتاب کا مطالعہ ترک کر دیا ہے''۔ان کی ذاتی زندگی میں بھی ہمیں ایسا لگتا ہے کہ قرآن مجید کا اثر بہت زیادہ تھا' خود ایک خط میں کہتے ہیں کہ: ''میں چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں' تمنّا ہے کہ قرآن سے متعلق اپنے افکار قلم بند کرتا چلا جاؤں۔''

ان کا ارادہ تھا کہ تفہیم قرآن مجید کے حوالے سے کچھ نوٹس مرتب کریں' لیکن انہیں اس کا موقعہ نہیں ملا۔ان کی ذاتی زندگی میں بھی نظر آتا ہے کہ قرآن مجید سے ان کا تعلق غیر معمولی تھا۔

اُمت کی زبوں حالی کا سبب:

جہاں تک یہ معاملہ ہے کہ اُمت مسلمہ کو زوال کیوں درپیش ہے' اور وہ زوال سے کیسے نکلے؟ تو اس کا حل بھی اقبال نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ

''تم قرآن کو چھوڑنے کی وجہ سے ذلت کا شکار ہو گئے ہو' اور شکوہ گردشِ ایام کا کرنے لگے ہو۔ اے شبنم کی طرح زمین پر گرے ہوئے شخص! کتابِ زندگی تو تمہاری بغل ہی میں ہے (اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر خود کو سنبھالو)۔''

اقبال نے جا بجا اس نظریے کو بیان کیا ہے' جیسے:

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

اور

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا مری خاک جگنو بنا کر اڑا!

اقبال کے یہاں شراب کہن سے مراد یہی قرآن مجید ہے۔

ایک جگہ طلوعِ اسلام کے ایک شعر میں مردِ مؤمن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے بھی اس شراب کا ذکر کیا ہے:

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے دلِ گرمے' نگاہِ پاک بینے' جانِ بیتابے

''مرد کو کیا چاہیے! ایک بلند طبیعت اور ایک شراب جو بہت پاک و خالص ہے' ایک گرم دل' پاک بین نگاہ' اور ایک بے تاب جان۔''

وہ پاک شراب کیا ہے؟ یہی قرآن مجید۔

امتِ مسلمہ کی خرابی کی ایک اور بڑی وجہ وہ ہے جسے اقبال نے ''پیر و مرید'' میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے نقل کیا ہے کہ:

دستِ ہر نااہل بیمارت کند سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

''ہر نااہل کا ہاتھ تجھے بیمار کر دے گا' اپنی ماں کے پاس آ' وہ تیری تیمارداری کرے گی۔''

آج کل اس کی تعبیر ''مدر ڈسکورس'' کے عنوان سے کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کا مدر ڈسکورس یعنی بنیادی موضوع قرآن و سنت ہے۔ ہمیں اسی کی طرف لوٹنا ہے' اور اسی سے ہمارے لیے راہ بنتی ہے۔

اسی طرح سے ایک اور جگہ اقبال نے فارسی میں کہا ہے کہ:

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو!

''اگر تم اس بُت خانے یعنی دنیا میں کوئی مقام و مرتبہ چاہتے ہو تو حق تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کر لو اور نبی کریم ﷺ کے طریقے پر چل پڑو۔''

ترقی اور عروج کی جو تجاویز آج مسلمانوں کو دی جا رہی ہیں ان کے برعکس کہتے ہیں کہ ترقی کا ایک ہی طریقہ ہے' اور وہ یہ کہ اپنا دل حق تعالیٰ کے ساتھ لگا لو اور پیغمبر ﷺ کے راستے پر چل پڑو۔

یقین کی اہمیت:

درحقیقت قرآن مجید ہی ایسی کتاب ہے جو ایمان و یقین پیدا کرتی ہے۔ اقبال نے بھی یقین کی دولت پر خاص زور دیا ہے' اور اس پہلو پر بہت سے اشعار کہے ہیں' مثلاً:

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی

اِس وقت جس تہذیب کے سحر میں امتِ مسلمہ گرفتار ہے' اس تہذیب کا اصل الاصول اقبال نے بیان کر دیا ہے۔ ''جاوید نامہ'' میں ایک جگہ اقبال اسی دورِ حاضر کے بارے میں کہتے ہیں:

علم و فن' دین و سیاست' عقل و دل زوج زوج اندر طوافِ آب و گِل

''اس پوری دنیا کا منظر نامہ یہ ہے کہ ہر جگہ چاہے علم ہو یا فن' خواہ دین ہو یا سیاست' خواہ تعقّل کے معاملات ہوں یا دل کے' سب کے سب آب و گل (یعنی دنیا) کے طواف میں لگے ہوئے ہیں۔ چناں چہ اس آب و گل سے پرے ان کا نہ کوئی تصور ہے نہ کوئی امید ہے اور نہ ہی کوئی تعلق۔''

نظریاتِ اقبال کی تشکیل میں قرآن کا کردار:

اب دیکھتے ہیں کہ اقبال کے تصورات کی تشکیل میں قرآن کا کیا اثر ہے' اور اقبال کے بنیادی نظریات میں قرآن کا کیا عمل دخل ہے؟

اقبال کا تصورِ خودی:

اقبال کے یہاں ایک بنیادی تصور خودی کا ہے۔ اس کی بنیاد بھی قرآن میں موجود ہے۔ خود انہوں نے بھی بہت سی جگہوں پر اسے بیان کیا اور ایک سے زائد آیات کی طرف اشارہ بھی کیا۔ یوسف سلیم چشتی صاحب نے ایک جگہ نقل کیا ہے کہ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا جو خودی کا تصور ہے' کیا اس کا ماخذ قرآن مجید کی آیت: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ ہے؟ تو کہا کہ ہاں! ایسا ہی ہے۔ اگرچہ ﴿عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ کا مطلب اور بھی لیا گیا ہے' لیکن یہاں اس معنیٰ میں ہے کہ اپنے نفس کی نگہبانی کرو۔ اسی طرح سید نذیر نیازی کا بھی ایک واقعہ ہے کہ انہوں نے اقبال سے پوچھا کہ آپ کی فکر کا ماخذ کیا ہے؟ اقبال نے کہا کہ کل آنا تو تمہیں بتاؤں گا' اور پھر جب وہ دوسرے دن گئے تو اقبال نے قرآن مجید منگوایا' اور سورۃ الحشر کی یہ آیت ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا

كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ پڑھ کر سنائی۔ لہٰذا خود اقبال نے بھی یہی بیان کیا کہ میری فکر قرآن سے مستعار ہے، اور اقبال کو اس کا اتنا یقین و اعتماد تھا کہ انہوں نے اس کا دعویٰ غیر معمولی جوش میں کیا۔ اس سلسلے میں ان کے کچھ اشعار بھی مشہور ہیں:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن ایں خیاباں را زخارم پاک کُن
روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا بے نصیب از بوسہ پا کُن مرا

''یعنی اگر میرا دل ایک بے فائدہ جوہر ہے' اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا بھی کچھ چھپا ہوا ہے' تو اے اللہ! میری فکر و عزت کا پردہ چاک کر دے' اور اس دنیا کے خیابان کو میرے کانٹے سے پاک کر دے' اور محشر کے دن مجھے خوار و رسوا کر' اور مجھے رسول اللہ ﷺ کی قدم بوسی سے محروم کر دے۔''

ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے' اس کو حرف بحرف نہیں لینا چاہیے۔ یہ کوئی درست طریقہ کار نہیں کہ ہم ترازو لے کر بیٹھ جائیں اور ایک ایک شعر کو تولنے لگ جائیں۔ کیوں کہ یہ درحقیقت ایک پُر جوش ارادہ' نیت اور اس پر اعتماد ہے جس کے وفور سے اس طرح کلام کیا گیا ہے۔

اقبال اس پر بھی یقین رکھتے تھے کہ قرآن مجید ایک مکمل دستورِ حیات ہے اور ہماری اجتماعی راہ نمائی کا ابدی مدار بھی۔ اقبال نے اپنی اس فکر کو چھپائے بغیر بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے' جس کی وجہ سے آج کل کے لبرل حضرات کے یہاں اقبال کو مطعون بھی کیا جاتا ہے اور ان میں سے بہت سے لوگ اقبال کو بڑا شاعر بھی تسلیم نہیں کرتے' ان پر بڑی بڑی تہمتیں لگاتے ہیں' لیکن اقبال نے اپنے اس تصور کو کبھی نہیں چھپایا کہ امت مسلمہ کی حیات قرآن مجید کے ساتھ تعلق سے وابستہ ہے' اور اسی طرح فرد کی حیات بھی اس قرآن مجید سے تعلق میں مضمر ہے:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

''اگر تم ایک مسلمان کی سی زندگی گزارنا چاہتے ہو تو قرآن کو تھامے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔''

اور ایک اور جگہ کہا ہے:

بہ بندِ صوفی و ملا اسیری حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست کہ از 'یٰسینِ' او آساں بمیری

''تم صوفی اور ملا کی جکڑ بندیوں کے اسیر ہو' اس لیے تم نے قرآن مجید کی حکمت سے زندگی کا لائحہ عمل طے نہیں کیا' اور بدقسمتی یہ ہے کہ اب اس قرآن سے تمہارا تعلق اسی قدر رہ گیا ہے کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے تم اپنے مرنے والوں کی جان کنی میں آسانی کروا لیتے ہو۔''

جدید فکر کا ایک المیہ یہ ہے کہ اکثر جدید احیائی مفکّرین جنہوں نے قرآن مجید کے ساتھ تعلق یا اس کی طرف لوٹنے کی بات کی ہے' کے یہاں یہ بات خاص طور پر نظر آتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کو نظر انداز کیا جاتا ہے' یعنی وہ نبی اکرم ﷺ کے متبادل کے طور پر یہ بات کہتے ہیں کہ قرآن سے تعلق قائم کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ

بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔

جدید دور کی اس گمراہی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس دور میں قرآن سے تعلق بہت کمزور ہو گیا ہے۔ اگر ہم اپنے اکابرین کو دیکھیں اور ان کے حالات پر غور کریں' امام غزالی' ابن تیمیہ' ابن قیم اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین' اور ان کی تصنیفات پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ ان کو والہانہ شغف تھا۔ ان کے یہاں قرآن مجید کی اہمیت وعظمت کا بڑا غیر معمولی اظہار ملتا ہے۔ اس کے برعکس آج کل لوگ قرآن مجید کی عظمت کو اتنی اہمیت سے بیان نہیں کرتے۔ اس کا سبب بھی شاید یہی ہے کہ قرآن مجید کی اہمیت وعظمت کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کرنے والوں کی اکثریت کا وتیرہ یہی رہا ہے کہ وہ سنت رسول ﷺ کے ساتھ استخفاف کا رویہ رکھتے ہیں۔ لیکن اقبال کے یہاں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تعلق اور یہ فکر کہ قرآن سے تعلق پیغمبر ﷺ سے تعلق کے ساتھ مشروط ہے' بے حد نمایاں ہے۔ اقبال نے اپنے تاثرات میں یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں قرآن مجید پڑھنا چاہیے' قرآن مجید پڑھنے سے انسان کے دل میں نسبتِ محمدی ﷺ پیدا ہوتی ہے۔ اور اپنی شاعری میں تو انہوں نے بہت ہی خوب کہا ہے کہ:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است آبروئے ما زنامِ مصطفیٰؐ است

''نبی اکرم ﷺ کا مرتبہ ہر مسلمان کے دل میں ہے' اور ہماری آبرو نبی اکرم ﷺ کے تعلق سے ہے۔ اس کے سوا ہمارے پلے کچھ بھی نہیں۔''

اور ایک جگہ فرمایا کہ:

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

''جس آدمی کی پونجی نبی اکرم ﷺ سے عشق و تعلق ہے' سارے بحر و بر اس کے دامن میں ہیں۔''

مزید فرماتے ہیں کہ:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا' لوح و قلم تیرے ہیں!

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰؐ او را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

اور عصر حاضر کی نحوست سے متعلق بڑا خوب صورت شعر کہا کہ:

عصرِ ما مارا زما بیگانہ کرد از جمالِ مصطفیٰؐ بیگانہ کرد

''عصرِ حاضر نے ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا' ہمیں نبی اکرم ﷺ کے جمال سے بیگانہ کر دیا۔''

بات وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوئی: ﴿نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ ہم نے خود کو مغربی اصطلاحات میں پرونا شروع کر دیا ہے' ان کی اصطلاحات کو اپنی شناخت کے لیے قبول کر لیا ہے' اس لیے ہم نے اپنے آپ کو بھلا دیا۔ اسی طرح اقبال کا ایک بڑا خوب صورت شعر ہے کہ:

در عجم گردیدم و ہم در عرب مصطفیٰؐ نایاب و ارزاں بولہب

''میں نے عرب بھی گھوم کر دیکھ لیا اور عجم بھی دیکھ لیا' لیکن المیہ یہ ہے کہ مصطفوی نسبت رکھنے والے نایاب ہیں' اور بولہبی نسبت رکھنے والوں کی ارزانی ہے۔''

بہرحال اقبال کے حوالے سے یہ دوسری بات بھی بہت اہم ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ سے تعلق کو کہیں مجروح نہیں ہونے دیتے۔

امت کی شیرازہ بندی قرآنی آئین پر ہی ممکن ہے:

تیسری بات اقبال کے یہاں یہ ملتی ہے کہ قرآن مجید کو چھوڑ کر اس امت کی اجتماعیت اور آپس کی جمعیت بھی کسی طور پر ممکن نہیں ہے۔ اقبال نے اسی مضمون پر مشتمل ایک عنوان بھی قائم کیا ہے:

''درمعنیٔ ایں کہ نظام ملت غیر از آئین صورت نہ بندد' و آئین ملت محمدیہ قرآن است''

اس معانی کے بیان میں کہ بغیر کسی آئین کے کسی بھی ملت کی شیرازہ بندی ممکن نہیں ہے' اور ملت محمدیہ کا آئین قرآن ہے۔ اور اس کے تحت کہتے ہیں کہ:

ہستیٔ مسلم ز آئین است و بس باطنِ دینِ نبیؐ این است وبس

''مسلم انسان کی ہستی آئین اسلام کی پابندی کے باعث ہے' رسول اللہ ﷺ کے دین کی روح و باطن بس یہی امر ہے۔''

مزید کہتے ہیں کہ:

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ زیر گردوں سِرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لا یزال است و قدیم
نسخہ اَسرارِ تکوین حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے' تبدیل نے آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ او رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِیْن

''تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارا آئین کیا ہے؟ آسمان کے نیچے تمہارے لیے تمکین کا باعث کیا ہے! یہ قرآن حکیم ہے جو زندہ کتاب ہے' جس کی حکمت لایزال اور قدیم ہے' تکوین حیات کے اسرار کا نسخہ اسی میں ہے۔ جو لوگ بے ثبات ہوں' جو مضبوطی سے پاؤں کو جما نہ سکتے ہوں' اس قرآن کے ذریعے ثبات حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے ایک حرف میں بھی نہ کوئی شک ہے اور نہ کوئی تبدیلی کا امکان۔ اس کی آیتیں شرمندۂ تاویل نہیں ہیں۔ انسانیت کے لیے یہ آخری پیغام ہے' اور اس کے حامل رحمۃ للعالمین ﷺ ہیں۔''

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال تعلقِ رسول ﷺ کے رشتے کو کہیں منقطع نہیں ہونے دیتے۔ اس کے علاوہ اقبال اور قرآن کے حوالے سے اور بھی نظریے ہیں۔

اسلام اور قوت کا لزوم:

اقبال کے حوالے سے یہ نظریہ بھی بہت اہم ہے کہ وہ اسلام کے ساتھ طاقت اور قوت کے بھی قائل ہیں۔قرآن میں بھی اسلامی حوالے سے طاقت اور قوت کا بیان موجود ہے' اور یہ بہت ہی اہم ہے۔ کیونکہ جدید دور میں مغرب کو جو اسلام پسند ہے' وہ modernist اسلام' liberal اسلام' progressive اسلام اور reformist اسلام ہے۔اور جو اسلام مغربی قوتوں کو کھلتا ہے' اسے وہ کہیں redical اسلام' کہیں fundamentalism' کہیں politicle اسلام' اور کہیں Islamism کہتے ہیں۔اس اسلام میں خاص بات یہی ہے کہ اس میں قوت و طاقت کا نظریہ ملتا ہے۔قرآن مجید میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قوت و طاقت کی اہمیت کا بیان زیادہ ہوا ہے۔سورۃ الحدید میں انبیاء کرام اور کتب کے انزال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی اس نعمت کو خاص طور پر گنوایا ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ (آیت ۲۵)

''اور ہم نے لوہا بھی اتارا' اس میں سخت طاقت ہے اور لوگوں کے لیے دیگر فائدے ہیں۔''

اور اسی طرح ایک جگہ پیغمبروں کے بارے میں ہے:

﴿وَاذْكُرْ عِبٰدَنَا اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِىْ وَالْاَبْصَارِ ۝۴۵﴾ (صٓ)

''اور ذکر کرو ہمارے بندوں ابراہیم' اسحاق اور یعقوب کا جو ہاتھ والے (قوت والے) اور بصیرت والے تھے۔''

طاقت اور علم یہ دونوں چیزیں بہت اہم ہیں۔جدید زمانے میں مغرب کا جو غلبہ ہے اس کی بنیاد بھی یہی دو چیزیں ہیں' علم اور طاقت۔اور اب تو عموماً کہا جاتا ہے کہ علم بھی فقط حصولِ طاقت کا ایک ذریعہ ہے۔قرآن مجید میں بھی بنی اسرائیل پر طالوت کو بادشاہت کے لیے منتخب کرتے ہوئے ان کی یہی فضیلت شمار کی گئی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۴۷)

''اللہ تعالیٰ نے ان کو تم میں سے منتخب کیا ہے اور انہیں وسعت دی ہے علم میں بھی اور جسم میں بھی۔''

بہر حال اقبال کے یہاں بھی اسلامی معاملات میں طاقت اور قوت کا تصور پایا جاتا ہے۔ایک جگہ اپنے ملفوظات میں کہتے ہیں کہ امر بالمعروف' نہی عن المنکر اس امت کی بڑی ذمہ داری ہے' لیکن اس امر کے لیے اس کے ہاتھ میں تلوار کا ہونا ضروری ہے' قوت کا ہونا ضروری ہے' ورنہ بات کمزور پڑ جاتی ہے اور اس کی اہمیت جاتی رہتی ہے۔اور یہ تصور اقبال کے اردو اور فارسی دونوں کلام میں پایا جاتا ہے۔

اثنائے کلام میں وہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تلمیح بار بار لے کر آتے ہیں:

لاکھ حکیم سر بجیب' ایک کلیم سر بکف　　مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی

اسی طرح ایک جگہ فرماتے ہیں:

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم　　عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اور آگے اقبال کہتے ہیں:

جز بقرآں ضیغمی روباہی است　　فقرِ قرآں اصل شاہنشاہی است

''قرآن کے بغیر شیر بھی لومڑی ہے (یعنی طاقت بھی مکاری ہے)' قرآن مجید کا بیان کردہ فقر اصل شہنشاہی ہے۔''

اقبال کے کلام میں قوت کا نظریہ وتصور جا بجا ملتا ہے' خاص طور پر شرف النساء بیگم کا قصر جب اقبال نے دیکھا' تو اس وقت جو اشعار کہے وہ بہت اہم ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہم جب رجوع الی القرآن کورس کر رہے تھے تو ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں یہ نظم پڑھائی' اور یہ اشعار پڑھاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب پر بہت رقت طاری ہوگئی تھی' کیوں کہ اس خاتون کا کہنا تھا کہ میری زندگی کا کل اثاثہ دو چیزیں ہیں: ایک قرآن اور ایک تلوار۔ اس خاتون کے مرنے سے قبل اقبال کا ایک مکالمہ ان کی والدہ سے ہوا ہے' اس کا بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

گفت اگر از رازِ من داری خبر　　سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند　　کائناتِ زندگی را محور اند

''کہا کہ اگر تم میرا راز جاننا چاہتے ہو تو یہ شمشیر ہے اس کو تھام لو اور قرآن کی نگہبانی کرو' یہ دو چیزیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں' اور یہ دونوں زندگی کی کائنات کا محور ہیں۔''

حُبِّ رسول ﷺ کا معیار جہاد سے محبت ہے:

اور بھی کئی مقامات ہیں جہاں اقبال نے قرآن اور تلوار یا علم اور طاقت دونوں کی یکجائی کی اہمیت بیان کی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک چھوٹا سا مضمون ہے: ''قرآن اور جہاد'' اس میں یہی نظریہ ہے کہ اسلام کے پہلے دور میں جو مسلمانوں کو عروج ملا اس کی بنیاد یہی قرآن اور جہاد تھی۔ مرحوم اکثر بیان کرتے تھے کہ ایک مردِ مؤمن کا نقشہ یہ ہونا چاہیے کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار ہو۔ قرآن کے ذریعے ایمانِ حقیقی کا حصول ہوگا' اور پھر اس ایمان کا مظہر جہاد ہوگا۔ یعنی اللہ اور اس کے پیغمبر ﷺ سے تعلق کا ایک مظہر قرآن سے تعلق ہے' اور ایک مظہر جہاد سے تعلق ہے۔ جیسے اس آیت میں بیان کیا گیا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ﴾ (التوبۃ:٢٤)

''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیں اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو' اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو ٹھہرو' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے۔''

محض محبت تو ایک معنوی حیثیت رکھتی ہے' کوئی بھی آدمی اس کا دعویٰ کر سکتا ہے' دعوے تو بہت ہیں' کیوں

کہ یہ ایک معنوی امر ہے۔ ہر مسلمان کہتا ہے کہ مجھے اللہ اور رسول ﷺ سے بہت محبت ہے' لیکن اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا معیار کیا ہے؟ وہ معیار ہے جہاد سے محبت!.....اور جہاد بھی بالکل اپنے خالص مفہوم قتال فی سبیل اللہ میں! چنانچہ اقبال کے یہاں یہ پہلو بھی بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

آخر میں کچھ اشعار رقم کر کے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں' جس میں اقبال نے مسلمانوں کو جھنجوڑا ہے' اور عمل پر ابھارا ہے' وہ کہتے ہیں:

اے کہ می نازی بقرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ می باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن
کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس!

''اے وہ شخص جو قرآن عظیم پر اس وجہ سے ناز کرتا ہے کہ اس کے پاس اللہ کا آخری کلام ہے اور وہ اس کا محافظ ہے! تم کب تک حجرے میں مقیم رہو گے' گوشہ گیر رہو گے؟ اس جہان میں دین کے اسرار کو فاش کرو' ان کا اظہار کرو' اور اللہ کی شریعت مبین کے نکتے کو فاش کرو' اور وہ نکتہ اصل میں یہ ہے کہ اس زمین میں کوئی کسی غیر اللہ کا محتاج نہ رہے۔''

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا جاتا تھا کہ تم ہمارے یہاں کاہے کو آئے ہو؟ تو وہ کہتے تھے:

لِنُخْرِجَ العِبَادَ مِنْ عِبَادَةِ العِبَادِ إلٰی ربِّ العِبَاد

''تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر بندوں کے رب کی غلامی میں لے آئیں!''

یعنی شرعِ مبین کا اصل نکتہ اور جوہر یہی ہے' اور اس کے لیے ایک انقلاب درکار ہے۔ وہ انقلاب پہلے باطن میں آئے گا' اور پھر ظاہر میں۔ یعنی پہلے انفس میں اور پھر آفاق میں۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

''جب یہ قرآن کسی کی جان میں اتر جاتا ہے تو اس کی جان بدل جاتی ہے' اور جب جان بدل جاتی ہے تو جہان بدل جاتا ہے۔''

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ اس بات کو بہت عمدگی سے بیان کرتے تھے کہ انسان کی آرزو اور تمنا بھی اسی انسان کا ایک اہم حصہ ہوتی ہے' اسی تمنا پر اقبال کی ایک چھوٹی سی نظم ہے' اس پر ہم بات ختم کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے!
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے!
وہی شراب' وہی ہائے و ہو رہے باقی طریق ساقی و رسمِ کدو بدل جائے!
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے!

(جناب حافظ محمد رشید ارشد کا قرآن اکیڈمی یاسین آباد کراچی میں منعقدہ سیمینار بعنوان ''اقبال اور ہم'' میں اظہارِ خیال)